ہمارے دینی مدارس

یعنی

تاریخ مدارسِ دینیہ

از

فقیہ العصر حضرت مولانا

مفتی عبدالشکور صاحب ترمذی

نور اللہ مرقدہ

فقیہ العصر حضرت مفتی سید عبد الشکور ترمذی قدس سرہ

ہمارے دینی مدارس

یعنی

تاریخ مدارس دینیہ

بعد الحمد و الصلوٰۃ:

گذارش آنکہ ماہنامہ دارالعلوم دیوبند میں شائع شدہ مضامین ''اسلام کا ابتدائی نظام تعلیم'' اور ''قدیم نظام تعلیم کی ایک جھلک'' نظر سے گذرے، اپنی افادیت اور ضرورت زمانہ کے لحاظ سے یہ دونوں مضامین بہت ہی اہم اور وقیع معلوم ہوئے مگر بہت طویل اور متفرق قسطوں میں شائع ہونیکی وجہ سے عام طور پر ان سے استفادہ مشکل تھا اس لیے خیال آیا کہ ان مضامین میں سے مختصر طریقہ پر انتخاب کرکے بعض ضروری اور مناسب مضامین کے ساتھ ایک مختصر مجموعہ مرتب کردیا جائے تاکہ اس کا نفع عام ہو اور اس سے استفادہ کرنا بھی آسان ہو اور متفرق مضامین بھی یکجا دستیاب ہوسکیں۔

چنانچہ یہ کتابچہ ''ہمارے دینی مدارس یعنی تاریخ مدارس دینیہ'' انہی مضامین بالا سے منتخب اور مرتب کیا گیا ہے اور کہیں کہیں ''نبوی نظام تعلیم'' مرتبہ

منشی عبدالرحمٰن صاحب چہلیک ملتان سے بھی اس میں استفادہ کیا گیا ہے اور کتب تاریخ وغیرہ کے حوالہ جات کے متعلق بھی ان مضامین میں دیے ہوئے حوالجات پر ہی اعتماد کیا گیا ہے۔

آج کل علوم دینیہ اور مدارس دینیہ کی طرف سے مسلمانوں میں عام طور پر جو بے اعتنائی اور بے توجہی پائی جارہی ہے وہ تو قابل شکایت ہے ہی مگر زیادہ تر افسوس اس کا ہے کہ اب بعض ایسے حضرات بھی دینی مدارس کو عموماً بے کار اور عضوِ معطل کی طرح ہی سمجھنے لگے ہیں جن کا ذہن دینی اور تبلیغی ہے اور ان کے اکابر و اسلاف نے ہمیشہ ان مدارس دینیہ کی سرپرستی فرمائی اور گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔

اس کتابچہ کے پڑھنے کے بعد عہد نبوت اور زمانہ خلافت راشدہ سے لے کر ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہندوستان پر قبضہ کر لینے تک عام مسلمانوں اور سلاطین اور امراء اسلام کے علوم دینیہ اور مدارس دینیہ کے ساتھ تعلق اور شغف کے حالات اور چیدہ چیدہ واقعات معلوم ہو کر ان حضرات کی غلط فہمی دور ہو گی، امید ہے کہ مدارس دینیہ کی طرف رغبت وشوق اور علوم دینیہ کے بقاء وتحفظ کی ضرورت واہمیت کا احساس پیدا ہو گا۔

ناظرین کو اس کتابچہ کے مطالعہ سے یہ بھی معلوم ہو گا کہ قدیم زمانہ میں دینی مدارس کی ضروریات کے پورا کرنے کیلئے بڑی بڑی زمینیں وقف ہوتی تھیں

اور امراءاسلام اس نیک مقصد کیلئے اپنی املاک کووقف کرنا بڑی سعادت سمجھتے تھے اسی لیے زمانہ قدیم میں دینی مدارس کیلئے تحصیل چندہ کا موجودہ طریقہ رائج نہیں تھا۔

اور اس سے یہ سوال بھی حل ہو جائے گا کہ جب قدیم زمانہ سے دینی مدارس کی کفالت کا سامان بڑی بڑی جائیدادوں اوراوقاف کی آمدنیوں کی صورت میں موجود تھا تو پھر انگریزی حکومت کے دور میں مدارس دینیہ کے احیاء اور علوم دینیہ کے تحفظ وبقاء کیلئے تحصیل چندہ کا موجودہ طریقہ کیوں اختیار کیا گیا تھا جس کو اس وقت عام طور پر سطحی نظر سے دیکھنے والے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ حالانکہ ابتداءاسلام میں جس وقت تک سلاطین اور امراء کے ایسے اوقاف معرض وجود میں نہیں آئے تھے جن سے دینی ضروریات کو پورا کیا جاتا تھا تو علوم دینیہ اور تمام امور خیر کی انجام دہی مسلمانوں کے عمومی چندہ سے ہی ہوتی تھی خود آنحضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض امور خیر کیلئے اصحاب خیر کو چندہ کی رغبت دلائی ہے اور آج بھی قومی اور ملکی ضروریات کیلئے چندہ کرنے کو نہ صرف یہ کہ عیب نہیں سمجھا جاتا بلکہ اس کو بہت بڑی قومی اور ملکی خدمت سمجھا جاتا ہے مگر افسوس کہ علوم دینیہ کیلئے تحصیل چندہ جس سے ''ملت اسلام'' کی حفاظت ہوتی ہے جو بنیاد ہے ''ملک اسلام'' کی حفاظت کی شرفاءاسلام اور معززین قوم کی نگاہ میں خار ہے۔

چندہ کا رائج الوقت طریقہ تو شرفاءاسلام کی نگاہ میں قابل ترک ہے مگر وہ اس پر غور نہیں فرماتے کہ اگر یہ طریقہ اس وقت اختیار نہ کیا جاتا یا اب اس کو ترک

کر دیا جائے تو دین اور علوم دینیہ کی حفاظت کی اس وقت اور کیا صورت تھی یا اب کیا صورت ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ یہ طریقہ اختیار کر کے علمائے کرام نے ملت اسلام کو مٹنے سے بچالیا کیا یہی وہ گناہ عظیم ہے جس کی پاداش میں علوم دینیہ کے حاملین اور ملت اسلامیہ کے ان محافظین کو قوم کی نگاہ میں عضو معطل کی طرح سمجھا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ گروہ اور دینی مدارس قوم پر بلاوجہ کا ایک بوجھ ہے اور ان پر قوم کا روپیہ خرچ کرنا اپنے سرمایہ کو ضائع کرنا ہے، فالی اللہ المشتکی۔ بہر حال اس کتابچہ سے معلوم ہوگا کہ کن ضرورتوں اور مجبور کن حالات میں علماء کرام نے چندہ کے اس مروجہ طریقہ کو اختیار اور برداشت کر کے علوم دینیہ کی حفاظت کا فریضہ انجام دیا تھا اور اب بھی اس فرض کی انجام دہی میں مشغول ہیں۔

یہ بات بھی اہل نظر کیلئے قابل غور ہے کہ کیا اب وہ اسباب اور حالات باقی نہیں رہے جن کی وجہ سے چندہ کا یہ مروجہ طریقہ اختیار کیا گیا تھا؟ اللہ تعالیٰ احقر کی دینی مدارس کی اس ناچیز خدمت کو قبول فرما کر نافع اور مفید فرماویں آمین۔

سید عبدالشکور ترمذی عفی عنہ

خادم مدرسہ عربیہ حقانیہ

ساہیوال ضلع سرگودھا

۲۶ رمضان المبارک ۱۳۸۶ھ

بسم اللہ الرحمٰن االرحیم

حامداًو مصلیاًو مسلماً:

قال النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم انما بعثت معلماً۔

ترجمہ: میں تو صرف معلم واستاذ کی حیثیت سے آیا ہوں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد بالا سے معلوم ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور دنیا میں تشریف آوری کا مقصد ہی انسانی دل ودماغ میں ایسی دینی تعلیم کی روشنی کا پیدا کرنا ہے جس کے ذریعہ سے انسان دنیا میں اپنے مالک حقیقی خداوند عالم کی مرضی کے موافق زندگی بسر کر سکے اور وہ تعلیم انفرادی، اجتماعی، دنیاوی واخروی تمام حالات میں اس کی راہنمائی اور ہدایت کر سکے اسلامی تعلیم کی اس ہمہ گیر جامعیت کے پیش نظر فطری اور طبعی طور پر اسلام میں تعلیم وتعلم علم سیکھنے اور سکھلانے کو جتنی اہمیت حاصل ہے اتنی کسی مذہب میں نہیں ہے اس اہمیت کا اندازہ لگانے کے لیے اسلام کے ابتدائی دور سے لے کر حکومت اسلامیہ کے ترقی اورعروج کے زمانہ تک کے عام مسلمانوں کی اسلامی تعلیم کے ساتھ دلچسپی اور وابستگی کے چیدہ چیدہ مختصر حالات اور امرا اور حکام اسلام کی علوم دینیہ کے اندر سعی اورکوشش کے چند واقعات پر ایک نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔

عہد رسالت اور مکی زندگی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بعد کی بارہ سالہ مکی زندگی میں

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور مددگاران رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اگر چہ رات دن حوادث وافکار کا ہجوم رہتا تھا لیکن اس آزمائشی دور میں بھی جس قدر پرسکون لمحے مسلمانوں کو مل جاتے تھے ان میں بھی وہ قرآن پاک کی تعلیم کا خصوصی اہتمام کرلیا کرتے تھے اس دور کے ایسے تمام مقامات کو جن میں مسلمانوں نے (خواہ تھوڑے عرصے کے لیے ہو) بیٹھ کر پڑھنے پڑھانے کا خصوصی انتظام کیا تھا ہم ان کو ''دینی مدرسہ'' سے موسوم کرتے ہیں۔

مدرسہ صحن ابی بکر رضی اللہ عنہ

سب سے پہلے جس مقام کو ہم اس دور میں تعلیم کا مرکز اور مدرسہ کہہ سکتے ہیں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا وہ چبوترہ ہے جو آپ کے گھر کے سامنے تھا جس پر آپ نماز اور قرآن پڑھا کرتے تھے اور کفار کے لڑکے اور عورتیں آپ کے گرد جمع ہو جاتے اور قرآن کو سنتے تھے، یہ بات کفار مکہ کو نا گوار ہوئی اور انہوں نے حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اس جگہ کے چھوڑنے پر مجبور کیا (بخاری، کتاب بدء الخلق)

مدرسہ دار ارقم

مکی زندگی میں ایسی خاص مرکزی جگہ جس میں مسلمان تعلیم کے لیے بلا روک ٹوک آتے جاتے ہوں اور اس میں طلبہ کیلئے خورد ونوش کھانے پینے اور قیام کا بھی انتظام ہو اس پریشانی اور بے سروسامانی کے دور میں بظاہر اس کا تصور بھی

نہیں ہوسکتا مگر حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی، جب ہم ارباب تاریخ وسیر کی دارارقم کے متعلق بتلائی ہوئی تفصیلات کو دیکھتے اور پڑھتے ہیں یہ مقام کوہ صفا کے دامن میں تھا جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تقریباً چالیس صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ قیام پذیر تھے جن میں مرداورعورتیں سب ہی شامل تھے اس گھر کے زمانہ قیام میں حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسلام کو قبول کیا تھا اس مکان میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم مع صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قیام پذیر تھے اور باقاعدہ تعلیم وتعلم میں مشغول رہے حضرت ابو بکر، حضرت حمزہ، حضرت علی رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین وغیرہم جیسے جلیل القدر صحابہ کرام اس مکان میں رہتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا تعلیمی مشغلہ جاری تھا اس مدرسہ دارارقم کے نظام پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بیان سے بھی روشنی پڑتی ہے ان کے فرمان کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

''مسلمان ہونے والوں کو ایک ایک دو دو کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی صاحب حیثیت کے پاس بھیج دیتے تھے اور یہ لوگ اس کے پاس رہ کر کھانا کھاتے تھے چنانچہ میرے بہنوئی کے گھر بھی دو آدمی موجود تھے ان میں سے ایک خباب بن ارت تھے، خباب میرے بہنوئی اور بہن کے پاس جا جا کر قرآن کریم کی تعلیم دیا کرتے تھے'' یہ مدرسہ دارارقم حضرت عثمان بن ارقع کے مکان میں قائم تھا یہ مکان اس زمانہ میں دارارقم کی بجائے اسلام کا مرکزی تعلیمی مقام

ہونیکی وجہ سے دارالاسلام کے نام سے مشہور ہو گیا تھا''۔ (سیرت حلبیہ)

اسلام کے ابتدائی دور کے اس مختصر مدرسہ کا نظام ناظرین کرام کے سامنے ہے کہ:

(۱) طلبہ کی تعداد چالیس کے لگ بھگ تھی۔

(۲) یہی جگہ پڑھنے کی بھی تھی اور رہائش کی بھی۔

(۳) طعام کا انتظام یہ تھا کہ طلبہ مالدار صحابہ کے گھروں پر بطور وظیفہ کے کھانا کھایا کرتے تھے۔

اس دور ابتلاء اور آزمائش کے زمانہ میں تعلیم کے اس قدر انتظام اور اہتمام سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اسلام میں تعلیمی مراکز اور مدارس دینیہ کے قیام کی کتنی ضرورت اور اہمیت ہے۔

مدرسہ شعب ابی طالب و مدرسہ بیت فاطمہ

اس کے علاوہ مکہ معظّمہ میں ہجرت کے قبل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بہنوئی اور بہن کے مکان پر بھی حضرت خباب کے قرآن پڑھانے کا ذکر اوپر آچکا ہے نیز ''مدرسہ بیت فاطمہ'' اور ''مدرسہ شعب ابی طالب'' (جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مع اپنے ساتھیوں کے ۷نبوی سے لے کر ۱۰نبوی تک قریش مکہ کے ظالمانہ مقاطعہ کرنیکی وجہ سے تین سال کا زمانہ اسارت گذرا ہے) وغیرہا میں بھی تعلیم کا سلسلہ جاری رہا اس کے نتیجہ میں فضلاء مکہ کی ایک

جماعت تیار ہوگئی اور دوسرے مقامات پر بھی وہ تعلیمی کام کرنے لگی۔

مدرسہ حبشہ

جب کفار مکہ کے ظلم وستم سے تنگ آ کر بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنی پڑی تو انہوں نے وہاں پر بھی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اس کو مدرسہ ارض حبشہ کے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

مدنی زندگی

اور حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ہجرت سے بھی پہلے تعلیم دینے کیلئے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو مدینہ منورہ روانہ فرمایا، انہوں نے سعد بن ضرارہ کے مکان پر تعلیم قرآن کا باقاعدہ سلسلہ جاری فرمایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معدودے چند کے علاوہ تقریباً تمام انصار مدینہ مسلمان ہوگئے اور اپنے بت توڑ دیے اور جب مصعب رضی اللہ عنہ مدینہ سے لوٹ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو ان کا خطاب مقری یعنی معلم پڑ چکا تھا (جمع الفوائد)

صحابہ رضی اللہ عنہم میں سب سے پہلے مقری استاد کا لقب حضرت مصعب کے نصیب میں تھا جس سے وہ معزز ہوئے اور انصار مدینہ کی مسجد بنی زریق میں حضرت رافع بن مالک رضی اللہ عنہ اور مسجد بنی بیاضہ میں حضرت سعد بن ضرارہ رضی اللہ عنہ پڑھایا کرتے تھے اور دار سعد بن خثیمہ نیز بنو نجار، بنو عبدالاشہل، بنو ظفر اور بنو عمرو بن عوف وغیرہم کے محلوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت

سے پہلے ہی تعلیمی مراکز اور مدارس قائم ہو چکے تھے۔

مدرسہ قبا

اور مدرسہ قبا کا تو ایک مستقل نظام تھا جو حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے بھی پہلے ہی قائم ہو چکا تھا کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ منورہ میں تشریف آوری سے پہلے ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ہجرت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا اور مہاجرین عموماً قبا ہی میں قیام پذیر ہوتے تھے۔

مدرسہ صفہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد مسجد نبوی کی بنا رکھی گئی اور حجرہ شریف کی پشت پر جانب شمال باب جبریل علیہ السلام اور باب النساء کے درمیان ایک وسیع چبوترہ ''دکۃ الاغوات'' کے نام سے موسوم تھا اس پر جو حضرات فروکش ہوتے تھے وہ ''اصحاب صفہ'' کہلاتے تھے اور یہی چبوترہ کبھی ''اصحاب صفہ'' کا ''صفہ'' تھا یہاں پر طلبہ کا ہجوم رہتا، بعض اوقات سینکڑوں کی تعداد ہو جاتی تمام اصحاب صفہ کی مجموعی تعداد چار سو تک پہنچتی ہے مختلف اوقات میں اس صفہ کے طالب علموں کی تعداد ستر، اسی تک پہنچ جاتی تھی، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یہ کام سپرد تھا کہ جو امداد اصحاب ثروت کی طرف سے ان طلبہ کیلئے آوے اس کی حفاظت کریں اور بحصہ مساوی اس کو ان پر تقسیم کر دیں، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے ذمہ طعام کا انتظام ہوتا تھا

کھانے کے سلسلہ میں ایسا بھی ہوتا تھا کہ کھجوروں کے گچھے مالدار صحابہ بھیج دیا کرتے تھے اور بعض مالدار صحابہ ان طلبہ کو اپنے ساتھ لے جاتے اور انہیں کھانا کھلا دیتے ان میں حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نہایت فیاضی سے کام لیتے تھے حتی کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ اسی اسی طلبا کو اپنے ہمراہ گھر لے جا کر ان کو کھانا کھلاتے (زرقانی)

جامعہ صفہ کے فاضلین قراء کہلاتے تھے یہیں کے طلبا نے دنیا میں اسلام کے علوم کو پھیلایا اور وہی حضرات باہر تعلیمی خدمات کے لئے بھیجے جاتے تھے۔

عہد رسالت میں جامعہ صفہ کے علاوہ مدینہ منورہ کے اندر دوسرے مدارس کا ذکر بھی علامہ سمہودی نے کیا ہے بعض کا ذکر اوپر اجمالی طور پر ہو بھی چکا ہے۔

عہد خلافت راشدہ

عہد رسالت کے بعد خصوصیت سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں حجاز اور ہر اسلامی آبادی میں قرآن مجید کی تعلیم کے لیے مستقل حلقے اور مکاتب قائم فرمائے حضرت ابو الدرداء رضی اللہ عنہ کو دمشق شام کی جامع مسجد میں قرآن پاک کی تعلیم کے لیے مقرر فرمایا ایک مرتبہ طلبہ کا شمار کرایا گیا تو معلوم ہوا کہ سولہ سو (۱۶۰۰) طالب علم ان کے حلقہ درس میں شریک ہیں (طبقات القراء للذہبی ص ۶۰۶)

قرآن مجید کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے درس حدیث کے حلقے

بھی قائم فرمائے اس کام کے لیے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو ایک گروہ کے ساتھ کوفہ اور معقل بن یسار، عبداللہ بن معقل اور عمران بن حصین کو بصرہ اور عبادہ بن صامت اور ابوالدرداء رضی اللہ عنہم کو شام میں مقرر فرمایا اور لوگوں کو تاکید کی کہ ان سے حدیث کی تحصیل کریں (ازالۃ الخفاء)

علامہ ابن جوزی نے سیرۃ العمرین میں لکھا ہے کہ حضرت عمر نے جو مکاتب قائم کیے تھے ان میں معلمین کی تنخواہیں مقرر تھیں اور ہر معلم کو پندرہ پندرہ درہم بیت المال سے ملتے تھے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ خلافت میں ان مدارس کو اور زیادہ وسعت حاصل ہوئی اور تمام ممالک مفتوحہ میں جابجا مکاتب اور مدارس قائم ہو گئے۔

عہد خلفاء و امراء اسلام

عہد رسالت اور خلافت راشدہ کے بعد اسلامی آبادی اور فتوحات میں اضافہ ہونے کے ساتھ تعلیمی مکاتب میں بھی ترقی ہوتی گئی یہاں تک کہ خلفاء اور امراء اور ارباب ثروت نے اپنے اپنے گھروں پر بھی تعلیمی انتظام کیا اور کوئی قابل ذکر اسلامی آبادی ایسی نہیں ملتی جس میں درس و تدریس کا انتظام نہ ہو تعلیم مفت ہوتی تھی غریب طلبہ کے کھانے کپڑے اور لکھنے پڑھنے کی ضروریات بغیر کسی معاوضہ کے پوری کی جاتی تھیں۔

عہد قدیم کے علمی حلقوں کی اب صرف دو یادگاریں باقی ہیں پہلی ٹیونس

کی جامع زیتون ہے جو تیسری صدی ہجری میں قائم ہوئی تھی یہ درس گاہ اس زمانہ کے عام طرز کے مطابق ٹیونس کی جامع اعظم میں قائم ہے اور شروع سے اب تک خاص عظمت وشہادت کی مالک ہے۔

دوسری یادگار مصر کا جامع ازہر ہے یہ عظیم الشان جامع مسجد فاطمی سلاطین مصر کے زمانہ کی یادگار ہے جامع ازہر کی تکمیل ۳۶۱ھ میں ہوئی ہے مگر اس کی علمی زندگی کی ابتداء چوتھی صدی اواخر سے ہوئی ہے مسجد کا وسیع صحن اور اندرونی حصہ قدیم طرز کے علمی حلقوں کی درس گاہوں کے طور پر کام آتا ہے جامع ازہر اسلامی دنیا کی سب سے بڑی اور قدیم یونیورسٹی ہے جو ایک ہزار سال سے جاری ہے اور آج جبکہ تقریباً تمام قدیمی مدارس صفحۂ ہستی سے محو ہو چکے ہیں یہ یونیورسٹی اپنی اسی قدیم شان وشوکت کے ساتھ باقی ہے دس پندرہ ہزار طلبا اس کے اندر تعلیم حاصل کرنے والے اور سینکڑوں اساتذہ اس میں تعلیم دینے کے لیے موجود رہتے ہیں۔

جامع ازہر کے مصارف واخراجات کے لیے مصر کے مختلف سلاطین نے جو جاگیریں وقف کی ہیں ان کی سالانہ آمدنی لاکھوں پونڈ ہے ابھی قریبی زمانہ میں دوسری جنگ سے کچھ پہلے کی بات ہے کہ مصر کے سابق شاہ فاروق نے اپنی جیب خاص سے ساٹھ ہزار مصری پونڈ جامع ازہر کو عطا کیے تھے حکومت کی سرپرستی اور اوقاف کی آمدنی کی بدولت آج بھی یہ جامع ازہر اپنے اقتدار اور عظمت کے لحاظ سے اس درجہ اونچا اور بلند ہے کہ شیخ الازہر کے منصب کو مصر کی وزارت عظمیٰ

سے بڑھ کر سمجھا جاتا ہے۔

علامہ مقریزی نے لکھا ہے کہ ''مدرسے کے بانی اول اہل نیشاپور ہیں جہاں سب سے پہلے مدرسہ بیہقیہ کی بنیاد ڈالی گئی (ج۲ص ۳۶۲)اورتاریخ فرشتہ میں ہے کہ ''۴۱۰ھ میں سلطان محمود غزنوی نے اپنے پایہ تخت غزنی میں ایک جامع مسجد عروس الفلک کے نام سے تعمیر کروائی اور اس کے ساتھ ایک عظیم الشان مدرسہ بھی تعمیر کرایا تھا مدرسہ کے ساتھ کتب خانہ بھی تھا جو نادرالوجود کتب سے معمور تھا مسجد ومدرسہ کے اخراجات کیلئے سلطان نے بہت سے دیہات کی آمدنی وقف کردی تھی''۔

سلطان محمود کی اس مثال سے تھوڑے ہی دنوں میں غزنی کے اطراف وجوانب میں بے شمار مدرسے قائم ہوگئے اور سلطان کے فرزند سلطان مسعود نے تو اپنے عہد سلطنت میں اس کثرت سے مدرسے قائم کئے کہ تاریخ فرشتہ کے بیان کے مطابق زبان ان کا شمار کرنے سے عاجز وقاصر ہے۔اسی زمانہ میں ابن خلکان کی روایت کے مطابق علامہ ابواسحاق اسفرائنی (المتوفی۴۱۸ھ) کیلئے نیشاپور میں ایک مدرسہ قائم ہوا۔

ان مدارس کے قیام کے کچھ عرصہ کے بعد دولت سلجوقیہ کے مشہور علم دوست وزیر نظام الملک طوسی (المتوفی ۴۸۵ھ) نے نیشاپور اور بغداد میں دو دارالعلوم قائم کئے جن کو تاریخ کے اوراق میں نظامیہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اس دارالعلوم

کیلئے جو بغداد ۴۵۹ھ میں قائم ہوا تھا چھ لاکھ دینار (تیس لاکھ روپے) کی گرانقدر رقم تو شاہی خزانہ سے مقرر تھی اور نظام الملک نے خود اپنی جاگیر کا دسواں حصہ اس کے لئے وقف کر دیا تھا طلباء کے لئے وظائف کا انتظام کیا گیا اور اساتذہ کیلئے بیش قرار مشاہرے مقرر کئے گئے۔

نظام الملک نے نہ صرف نیشا پور اور بغداد ہی میں دارالعلوم قائم کئے بلکہ اس نے حکم دے دیا کہ تمام ملک کے اندر جس جگہ بھی کوئی ممتاز عالم موجود ہو وہاں اس کیلئے ایک مدرسہ اور مدرسہ کے ساتھ ایک کتب خانہ قائم کر دیا جاوے چنانچہ اس کے زمانہ میں ہزاروں مدارس اور کتب خانے قائم ہوئے اس کے قبل سلطان محمود غزنوی اور اس کے بیٹے سلطان مسعود غزنوی نے اپنے اپنے عہد میں بکثرت مدرسے قائم کئے تھے، نظامیہ کے قیام سے قبل بھی اسی نیشا پور میں سعدیہ اور بیہقیہ کے نام سے دو بڑے دارالعلوم موجود تھے، سعدیہ سلطان محمود غزنوی کے بھائی امیر نصر نے قائم کیا تھا، امام الحرمین (امام غزالی کے استاد) نے بیہقیہ میں تعلیم پائی تھی جب نظامیہ قائم ہوا تو امام الحرمین کو اس کا صدر بنا دیا گیا۔

امام غزالی جیسے یکتائے زمانہ نظامیہ کے خوشہ چینوں میں ہیں نظامیہ کے علاوہ بغداد میں تیس اور بڑے بڑے دارالعلوم قائم تھے جن کے متعلق علامہ ابن جریر نے لکھا ہے کہ ''ہر مدرسہ بجائے خود ایک مستقل آبادی معلوم ہوتا ہے'' اور نظام الملک کے بعد خلیفہ مستنصر باللہ عباسی نے بغداد میں ۶۳۱ھ میں ایک

دارالعلوم المستنصریہ کے نام سے قائم کیا طلباء کے قیام وطعام، کاغذ قلم، دوات وغیرہ اشیاء بھی مدرسہ سے ملتی تھیں، اس کے علاوہ ایک ایک دینار (تقریباً پانچ روپے) ہر طالب علم کو ماہانہ وظیفہ ملتا تھا، خلیفہ مستنصر باللہ نے ان مصارف کیلئے جو وقف کیا تھا اس کی آمدنی آجکل کے حساب سے تقریباً چار لاکھ روپیہ سالانہ تھی۔

ہندوستان

ہندوستان میں اسلامی حکومت کا مستقل قیام ساتویں صدی ہجری کے شروع میں قطب الدین ایبک (۶۰۲ھ/۶۰۶ھ) سے شروع ہوتا ہے، اس پر بمشکل ایک صدی گذری تھی کہ ہندوستان علوم وفنون کا گہوارہ بن چکا تھا۔

علامہ مقریزی نے کتاب الخطط میں سلطان محمد تغلق کے زمانہ کی دھلی کی نسبت لکھا ہے کہ ''سلطان محمد تغلق کے عہد میں دہلی کے اندر ایک ہزار اسلامی مدارس قائم تھے جن میں مدرسین کیلئے شاہی خزانہ سے تنخواہیں مقرر تھیں، تعلیم اس قدر عام تھی کہ کنیزیں تک حافظ قرآن اور عالم ہوتی تھیں''۔

فیروز شاہ تغلق کے تعمیر کرائے ہوئے مدرسہ فیروز شاہی کے متعلق ضیاء برنی نے لکھا ہے ''مدرسہ کی عمارت نہایت وسیع ہے اور ایک بہت بڑے باغ کے اندر تالاب کے کنارہ پر واقع ہے ہر وقت سینکڑوں طلبہ اور علماء وفضلاء یہاں موجود رہتے ہیں باغ کے کنجوں میں سنگ مرمر کے فرش پر نہایت آزادی کے ساتھ علمی مشاغل میں منہمک نظر آتے ہیں''۔

عالمگیر اورنگزیب کے عہد کے متعلق ایک مغربی سیاح نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے ''سندھ کے ایک مشہور شہر ٹھٹھ میں مختلف علوم وفنون کے چار سو مدرسے قائم تھے''۔

حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دھلوی فرماتے ہیں کہ ''نواب نجیب الدولہ کی سرکار سے نوسو علماء کو وظائف ملتے تھے'' (ملفوظات) روہیل کھنڈ جیسے غیر معروف خطہ میں پانچ ہزار علماء مختلف مدارس میں درس دیتے تھے اور حافظ رحمت اللہ علی خان کی ریاست سے تنخواہ پاتے تھے۔

مختصر یہ کہ ہر زمانہ میں مسلمانوں نے علم کی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں اور سلاطین اور امراء بھی علمی فیاضی اور علماء وطلباء کی خدمت کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کو نجات اخروی کا ذریعہ سمجھتے تھے، سلاطین وامراء کی جانب سے علماء وطلباء کیلئے جائیدادیں وقف تھیں ان کی آمدنی ان کے خور دونوش اور تعلیمی مصارف کیلئے کفیل تھی اور اس طرح ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک تمام تعلیم عام اور مفت ہوتی تھی اور علماء اور طلباء بھی اپنے اپنے متعلقین کے لئے کسب معاش سے مطمئن ہو کر فراغت وسکون خاطر کے ساتھ درس وتدریس میں مشغول رہتے تھے نہ تو منتظمین مدارس کو چندوں کی اپیل کرنیکی ضرورت پیش آتی تھی نہ ہی طلباء کو دست نگر سمجھ کر طالب علمی کو عزت نفس کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے آنے سے پہلے تک یہی نظام تعلیم جاری تھا، دہلی، آگرہ، لاہور، ملتان، جونپور، لکھنو، خیر آباد، پٹنہ، اجمیر، سورت، دکن، مدراس، بنگال اور گجرات وغیرہ کے بہت سے مقامات علم وفن کے مرکز تھے صرف ایک صوبہ بنگال کے متعلق انگریز مصنف کیبری ہارڈی نے میکس مولر کے حوالہ سے یہ کیفیت بیان کی ہے "انگریزی عملداری سے قبل بنگال میں اسی ہزار مدارس تھے اس طرح ہر چار سو آدمیوں پر ایک مدرسہ کا اوسط نکلتا ہے اسی صوبہ بنگال میں سلاطین وامراء نے مدارس کیلئے جو جائیدادیں وقف کی تھیں ان اوقاف کا مجموعی رقبہ مسٹر جیمز گرانٹ کے بیان کے مطابق بنگال کے چوتھائی رقبہ سے کم نہ تھا اوقاف کے علاوہ سلاطین وامراء نقد وظائف کے ذریعہ سے بھی اہل علم کی اعانت کرتے تھے مدارس اور درسگاہوں کا ملک میں پھیلا ہوا یہ عظیم الشان سلسلہ کیونکر ٹوٹا اور یہ مدارس ومکاتب کیونکر تباہ کئے گئے اس سوال کے جواب کیلئے بارہویں صدی ہجری اور اٹھارہویں صدی عیسوی کی ہندوستانی سیاسی تاریخ کا جاننا ضروری ہے۔

ہندوستانی سیاسی تاریخ

ایسٹ انڈیا کمپنی جو ابتدا میں صرف تجارتی اغراض ومقاصد لے کر ہندوستان میں داخل ہوئی تھی ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی مشہور جنگ نے اس کو ایک نئی اور زبردست طاقت میں تبدیل کر دیا یہ نئی طاقت جس زمانہ میں ظہور پذیر ہوئی اس وقت بدقسمتی سے ہندوستان کی مرکزی طاقت پارہ پارہ ہو چکی تھی اور ملک میں

طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا ہندوستان کی اسی سیاسی کمزوری سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا اور وہ آہستہ آہستہ اپنی دسیسہ کاریوں اور ریشہ دوانیوں سے ملک پر قابض ہوتی چلی گئی تا آنکہ انیسویں صدی عیسوی کے اوائل تک پنجاب کے علاوہ پورے ہندوستان پر اپنا تسلط قائم کرلیا پرانے قانون اور قدیم نظام تعلیم وتہذیب کومنسوخ کر دیا جن قدیم مصارف کیلئے سلاطین وامراء نے طویل مدت سے بڑے بڑے اوقاف مقرر کئے تھے (جن کی کچھ تفصیل اوراق گذشتہ میں گزر چکی ہے) کمپنی کی حکومت نے ان تمام اوقاف کو۱۸۳۸ءمیں ضبط کرلیا ،وظائف حکومت کی تبدیلی کے ساتھ ہی موقوف ہو چکے تھےاس وقت تعلیم کا تمام تر دار ومداران ہی اوقاف پر تھا جواس مقصد کیلئے مخصوص کئے گئے تھے، ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر نے جو بنگال میں ایک بڑے سول عہدے پر فائز تھا۱۸۷۱ءمیں ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' نامی کتاب لکھ کراس سلسلہ کے تاریخی حقائق کو سرکاری کاغذات سے واشگاف کیا ہے۔

ہنٹر لکھتا ہے کہ''صوبہ بنگال پر جب ہم نے قبضہ کیا تو اس وقت کے قابل ترین افسر مال جیمز گرانٹ کا بیان ہے کہ اس وقت صوبہ کی آمدنی کا تخمیناً ایک چوتھائی حصہ جومعافیات کا تھا حکومت کے ہاتھ میں نہیں تھا''۔

۱۷۷۲ءوارن ہیٹنگز نے اور۱۷۹۲ءمیں لارڈ کالونواس نے ان معافیات کی واپسی کی مہم شروع کی مگرنا کام رہی ۱۸۱۵ءمیں حکومت نے پھراس معاملے کو

زور سے اٹھایا مگر عمل کی جرأت نہ ہوسکی، آخر ۱۸۴۸ء میں آٹھ لاکھ (۸۰۰۰۰۰) پونڈ کے خرچ سے مقدمات چلا کران معافیات اوراوقاف پر حکومت نے قبضہ پالیا۔صرف ان معافیات کی آمدنی سے حکومت کی آمدنی میں تین لاکھ پونڈ یعنی تقریباً ۴۵لاکھ روپے کا اضافہ ہوگیا اس کاروائی کا مسلمانوں کی علمی زندگی پر کیا اثر پڑا اس کی نسبت ہنٹر لکھتا ہے کہ:

''سینکڑوں پرانے خاندان تباہ ہوگئے اور مسلمانوں کا تعلیمی نظام جس کا دارومدار ان ہی معافیات پرتھاتہ وبالا ہوگیا مسلمانوں کے تعلیمی ادارے ۱۸سال کی مسلسل لوٹ کھسوٹ کے بعد یک قلم مٹ گئے''۔

اندازہ کیجئے کہ جب ایک دورافتادہ صوبہ بنگال میں جس کو اس زمانہ کے لحاظ سے کوئی خاص تعلیمی فوقیت اور مرکزیت حاصل نہ تھی تعلیمی اخراجات کیلئے پنتالیس لاکھ روپے سالانہ آمدنی کے اوقاف موجود تھے تو ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں بالخصوص ان مقامات میں جن کو تعلیمی مرکزیت اور تفوق حاصل تھا کس قدر اوقاف ہوں گے۔

اوقاف کی ضبطی نے مسلمانوں کے نظام تعلیم پر ایک ضرب کاری کا کام کیا علماء اوراساتذہ جواب تک ان ہی اوقاف کی آمدنی کی بدولت فکر معاش سے مطمئن اور بے فکر ہوکر درس وتدریس میں مصروف تھے وہ منتشر اور پراگندہ ہوگئے مدارس اور درس گاہوں پر سناٹا چھا گیا چنانچہ برک اپنی اس یادداشت میں

جو برطانوی پارلیمنٹ میں پیش کی گئی تھی لکھتا ہے:

''ان مقامات میں جہاں علم کا چرچا تھا اور جہاں دور دور سے طالب علم پڑھنے کیلئے آتے تھے آج وہاں علم کا بازار ٹھنڈا پڑ گیا''۔

مگر ان حوادثات زمانہ اور گردش ایام کے باوجود بھی ہندوستان میں کچھ ایسے سخت جان علماء موجود تھے جن کا علمی فیضان کسی مالی اعانت وامداد کا چنداں محتاج نہ تھا دہلی میں حضرت مولانا مولانا شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی رحمہ اللہ کا خاندان اور لکھنو میں ملا نظام الدین کا گھرانہ اور خیرآباد کا مشہور علمی خانوادہ سینکڑوں میں چند ممتاز مثالیں ہیں ایسے حضرات ہر قسم کے حوادثات ومصائب کو برداشت کر کے اپنے کام میں مصروف اور علمی خدمت میں ہمہ تن لگے ہوئے تھے کہ ۱۸۵۷ء کی دارو گیر کا قیامت خیز ہنگامہ پیش آ گیا گنے چنے جو علماء باقی رہ گئے تھے ان پر برطانوی گورنمنٹ نے بغاوت کا جرم عائد کر دیا ان میں سے بعض کو پھانسیاں دی گئی گئیں بعض کالے پانی بھیج دیے گئے اور کسی کو جلاوطن کر دیا گیا جو بچے ان میں سے اکثر ممالک اسلامیہ کی طرف ہجرت کر گئے حضرت شاہ عبدالغنی صاحب دہلوی جو اس وقت ولی اللہی مسند علم کے جانشین تھے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کر کے چلے گئے ۱۸۳۸ء میں اوقاف کی ضبطی نے جو قدیم مدارس کو نقصان عظیم پہنچایا تھا انیس سال کے بعد ۱۸۵۷ء کے حادثہ نے اس کی تکمیل کر دی اب رہا سہا تعلیمی نظام بھی درہم برہم ہو گیا۔

قدیم مدارس اور مذہبی تعلیم کے ذرائع آمدنی اور اس کے متعلقہ لاکھوں روپیوں کے ان اوقاف کے تباہ اور برباد کرنے کے علاوہ (جن پر مذہبی تعلیم کا دارومدار تھا) کمپنی کی حکومت کے ۱۸۱۳ء کے ایک قانون کے ذریعہ یورپ کے پادریوں کو ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ واشاعت کیلئے مشن اسکول کھولنے کا موقع ہاتھ آگیا پادریوں کی سرگرمیاں جاری تھیں مشن اسکول کھولے جارہے تھے جن میں حصول تعلیم کیلئے سہولتیں مہیا کی جارہی تھیں کمپنی کے حکام پشت پناہ تھے اور ہر قسم کی امداد واعانت بہم پہنچاتے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ملازمتوں کا لالچ تھا دوسری طرف کمپنی کی اسکیم یہ تھی کہ ہندوستان کے بسنے والوں بالخصوص مسلمانوں کو مفلس بنا کر اور ملازمتوں کے حصول کی ترغیب دلا کر مشن اسکولوں میں تعلیم پانے پر مجبور کردیا جاوے جو اس وقت عیسائیت کی تبلیغ کیلئے سب سے بڑے ذریعے سمجھے جاتے تھے اس راہ کی سب سے بڑی رکاوٹیں مسلمانوں کے علوم اور ان کا دینی شعور اور مذہبی شغف تھا۔

اس لئے ۱۸۳۵ء کا تعلیمی نظام مرتب کیا گیا جس کی روح اور مقصد لارڈ میکالے (جو کہ ۱۸۳۵ء کی تعلیمی کمیٹی کے صدر تھے) کے نزدیک یہ ہے وہ لکھتا ہے:

"ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہیے جو ہمارے اور ہماری رعایا کے درمیان مترجم کا کام دے سکے اور ایسی جماعت ہونی چاہیے جو خون اور رنگ کے

اعتبار سے تو ہندوستانی ہو مگر مذاق، رائے، الفاظ اور سمجھ کے اعتبار سے انگریز ہو‘‘

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کمپنی کی یہ سکیم اور اس کا یہ نظام تعلیم مسلمانوں کی مذہبی زندگی، قومی روایات اور علوم وفنون کیلئے سخت تباہ کن اور مہلک ترین حربہ تھا اسی دوران میں ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ پیش آ گیا جس کی بے پناہ تباہ کاریوں ہولناکیوں نے دلوں کو ہیبت زدہ دماغوں کو ماؤف اور روحوں کو پژمردہ اور پوری قوم کو مفلوج کر دیا، حالت یہ ہو گئی تھی کہ مسلمانوں کو ذرائع معاش سے یکسر محروم کر دیا گیا تھا تعلیم سے بے رغبتی اور مذہب سے بیگانگی میں روز افزوں ترقی اور اضافہ ہو رہا تھا اور یہ وقت قریب تھا کہ علماء کی وہ نسل جو سابقہ درسگاہوں کی تعلیم یافتہ اور مذہبی شعور واحساس اپنے اندر رکھتی تھی رفتہ رفتہ ختم ہو جائے ایسے حالات تھے جن کی وجہ سے ملک کے ارباب علم وفضل نے یہ محسوس کیا کہ سیاسی زوال وانحطاط اور حکومت سے محرومی کے ساتھ اب مستقبل میں مسلمانوں کا علم اور مذہب اور قومی زندگی بھی سخت خطرہ میں ہے ان کی دور بین نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ فاتح قوم کے اثرات اور اس کے خصائص مفتوح قوم کے دل ودماغ اور علم و فکر پر اثر انداز ہو کر اس کے ملی شعائر، قومی خصائص اور فکر وعمل کی صلاحیتوں کو مٹا کر رکھ دیں گے جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اسلامی روایات اور اسلامی طور وطریقہ سے نفرت کرنے لگے گی اور اس کیلئے صرف فاتح قوم کی نقالی اور کورانہ تقلید واتباع ہی سرمایہ افتخار واعزاز بن کر رہ جائے گی اس وقت مذہبی تعلیم

کے سوا اور کوئی چیز فائدہ منداور کارگر نہ تھی جس سے اس خطرہ کا سدباب ہو سکے ایک یہی ایسی چیز تھی جس کے ذریعہ سے مسلمان اپنے مذہبی شعائر اور قومی خصائص کا تحفظ کر سکتے تھے اور مغلوب ومحکوم ہونے کے باوجود وہ بحیثیت مسلمان قوم کے زندہ رہ سکتے تھے اسی لئے اس وقت علماء کرام اور مذہبی رہنماؤں نے گردوپیش کے غیر مساعد حالات اور زمانہ کے دنیوی تقاضوں سے بے نیاز ہوکر فاتح قوم کے ارادوں اور سکیموں کے علی الرغم مسلمانوں کو اسلامی علوم وفنون کی تعلیم کی طرف زیادہ توجہ دلائی جس کے ذریعہ ان میں آئندہ مذہبی شعور کو برقرار رکھا جاسکتا تھا اور اس کے لیے قدیم مذہبی مدارس کی نشأۃ ثانیہ کو ضروری سمجھا گیا اور اس مقصد کے حصول کے لیے مدارس عربیہ قائم کیے گئے۔

مدارس عربیہ کی نشأۃ ثانیہ کا یہ کام ایسے ماحول اور دور میں شروع ہوا جبکہ قوم مسلم بحیثیت قوم مفلس ونادار اور حکومت متسلطہ کی دست نگر تھی اور وہ تمام اوقاف وغیرہ پہلے ہی ضبط کر لیے گئے تھے جن پر دینی تعلیم کی کفالت کا مدار تھا اسی مفلسی اور ناداری سے متاثر ہوکر بعض ہمدردان قوم نے محض دنیوی خیر خواہی کو مدنظر رکھتے ہوئے حکومت متسلطہ کی زبان اور علوم وفنون کے پڑھنے کو ضروری سمجھا تاکہ اس کے ذریعہ سے ملک میں منصب وعہدے بھی حاصل کیے جاسکیں اور اس سے معاشی ضروریات بھی پوری کی جاسکیں اسی لیے انہوں نے اس مقصد کے لیے لارڈ میکالے کی تجویز کردہ تعلیمی سکیم کی ہمنوائی کرتے ایسے سکولوں اور

کالجوں کی طرف رخ کیا جن کی ڈگریوں اور سارٹیفکیٹوں کے حصول پر ہی ملازمتوں اور عہدوں کے ملنے کا مدار تھا۔مگر اس کس مپرسی، بے بسی اور بے سروسامانی کی حالت میں بعض اہل دل اللہ والوں کے قلوب میں مدارس دینیہ کے احیاء کا داعیہ پیدا ہوا اور ایک مرد حق آگاہ اور درویش کامل عالم ربانی حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہ السامی نے ۱۸۶۷ء میں توکلاً علی اللہ دیوبند ضلع سہارنپور کی تاریخی مسجد چھتہ میں دار العلوم کی بنیاد رکھ دی اور تعلیم وتبلیغ کا نبوی نظام پھر سے قائم کر دیا۔

الحمدللہ ایک مسجد میں شروع ہونے والا یہ دار العلوم بہت جلد دنیائے اسلام کی بہت بڑی دینی درس گاہ بن گئی اور دور دراز ممالک اور ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے نہ صرف یہ کہ لوگ جوق در جوق علوم دینیہ اور فنون علمیہ کے حاصل کرنے کیلئے یہاں جمع ہونے لگے بلکہ ملک کے کونے کونے شہر شہر قریہ قریہ میں اس کی شاخیں قائم ہوگئیں اور شجرہ طوبی کی شاخوں کی طرح ہر طرف پھیل گئیں اس دار العلوم دیوبند کے فارغ التحصیل حضرات میں سے بہت سے حضرات آسمان علم پر مہر و ماہ کی طرح چمکے جیسے حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب شیخ المحدثین حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری حکیم الامۃ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہم اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ وغیرہم۔

ان میں سے صرف حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی دینی خدمات کا جائزہ

لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ پرانے قصبہ تھانہ بھون کی پرانی مسجد کے ایک گوشے میں بیٹھ کر اس زندہ دل درویش نے اصلاح امت کے لیے تعلیمی اور تبلیغی کتنا عظیم الشان کام کیا ہے حضرت والا کی تقریباً نوسو (۹۰۰) تصنیفات وتالیفات، مواعظ اور ملفوظات کے اوراق کو اگر آپ کے ایام زندگی پر پھیلایا جائے تو اوراق کی تعداد ایام زندگی سے بڑھ جاتی ہے۔

ہندوستان میں ان دینی مدارس سے کیسے کیسے علماء حق پیدا ہوئے اور انہوں نے مذہب وملک کی کیا کیا گرانقدر خدمات انجام دیں یہ ہمارے موضوع میں داخل نہیں اس وقت صرف اتنی بات کا عرض کر دینا ضروری سمجھا گیا کہ علماء حق نے یہ دینی مدارس ایسے وقت میں قائم کیے جس وقت ان مدارس کے نظام تعلیم وتبلیغ کو نہ کسی حکومت کی سرپرستی حاصل تھی اور نہ قومی خزانے کی پشت پناہی اور نہ ہی ملک کے لاکھوں روپیوں کی اوقاف کی آمدنی سے ان کو امداد حاصل ہوتی تھی بلکہ یہ نظام بظاہر صرف ملک کے دینی شعور واحساس رکھنے والے اہل خیر کی مالی امداد وتعاون اور چندہ کے موجودہ طریقہ پر چل رہا تھا اور درحقیقت بے سروسامانی اور محض اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر اس نظام کی بنیاد تھی ،غرضیکہ چندہ کے موجودہ مروج طریقہ کی بنیاد پر مدارس کا قیام کیا گیا اور ملک میں جابجا مدارس قائم کردیے گئے اس وقت سے یہ نیا نظام مدارس کے لیے جاری ہوگیا۔

علماء نے قوم کے سامنے دست سوال دراز کیا مدارس کے لیے چندے مانگے ہر طرح کے طعنے سنے کئی قسم کے اعتراضات برداشت کیے مگر تعلیم مذہب کو ہاتھ سے نہ جانے دیا اور فاتح قوم انگریز کے منصوبے کو کامیاب نہ ہونے دیا مدارس نے نہ صرف یہ کہ کمپنی کی تجویز کردہ لا مذہب بنانے والی مذکورہ تباہ کن سکیم اور مہلک ترین حربہ کی زد سے علم ومذہب کو بچا لیا اور عیسائیت کے تیز وتند طوفان اور بڑھتے ہوئے سیلاب عظیم کی لپیٹ سے ملک کو محفوظ کر لیا بلکہ مسلمانوں کو بحیثیت قوم مسلم کے مٹنے اور ختم ہونے سے بھی بچالیا ورنہ یہ نظام تعلیم اور مشن اسکول اور عیسائیت کی اشاعت کے لیے پادریوں کی سرگرمیاں جس کے پیچھے حکومت وقت کی بے پناہ قوت کام کر رہی تھی ہندوستان کے مسلمانوں کو اسی طرح اپنی لپیٹ میں لے لیتے اور ہندوستان کے مسلمانوں کا وہی حال ہو جاتا جس طرح اسپین کے مسلمانوں کا حال ہو چکا تھا کہ وہاں کی عیسائی حکومت کی بدولت وہاں کے تمام باشندے عیسائی ہو چکے تھے (نعوذ باللہ منہ)

ان مدارس کا ملت ومذہب اور قوم مسلم کو اغیار کے حملوں سے بچالینا ہی کیا ایسا نا قابل معافی جرم عظیم ہے جس کی پاداش میں سب سے بڑی اسلامی سلطنت پاکستان کے بسنے والے بعض طبقے یہ کہتے نہیں تھکتے کہ تعلیم جدید کے اس دور میں دینی مدارس کا کیا فائدہ ہے ان پر قوم کی دولت اور وقت کیوں ضائع کیا جا رہا ہے؟ قوم کے ان ہمدردوں اور بہی خواہوں سے کیا یہ عرض کیا جا سکتا ہے

کہ اگران مدارس کوقائم نہ کیاجاتااورلارڈ میکالے کامرتب کردہ نظام تعلیم اور عیسائیت کی تبلیغ کے لیےحکومت متسلطہ کی مساعی کے سامنےعلماءحق بھی گھٹنے ٹیک دیتے اور بڑے بڑے منصوبوں،عہدوں اورتنخواہوں کے لالچ میں آ کرانگریزی سکولوں اور کالجوں کارخ کر لیتے تو کیا۱۸۵۷ء کے بعدانگریزی دورکےتقریباًسوسالہ زمانہ میں مذہب کےتحفظ اوراس کے بقاء کی کوئی صورت باقی رہ گئی تھی۔

غورفرمایاجائے کہ جب مذہب ہی باقی نہ رہتااورمسلمانوں کوبحیثیت قوم مسلم کےختم کرکے عیسائیت اورلادینیت میں جذب کرلیاجاتاتوپھرپاکستان کے مطالبہ کرنے اوراس کی عمارت قائم کرنے کے لیےمسلم قومیت کابنیادی نظریہ کہاں سےدستیاب ہوتا۔

یہ مدارس اسلامیہ کیااسی لیے بےضرورت ہیں اوران پرقوم کی دولت اوروقت کاخرچ کرناقومی سرمایہ کاضیاع ہے کہ ان مدارس نےمسلم قومیت کاتحفظ کیااوراس کوحکومت وقت کی پوری کوشش کے باوجودمٹنےنہیں دیا جس کے نتیجے میں دنیائے اسلام کی سب سے بڑی اسلامی سلطنت پاکستان قوم مسلم کوخداوند قدوس کی طرف سے عطا کی گئی ہےمگرہم نے اس کی قدرنہیں کی اوراس میں اسلامی نظام جاری نہیں کیاجس کی وجہ سےاس کاایک بہت بڑاحصہ علیحدہ ہوگیا اورباقی حصہ بھی خطرہ میں ہےجس قوم کوان مدارس کی مساعی جمیلہ کی بدولت اتنی

عظیم الشان حکومت حاصل ہوئی ہواور جو مدارس حکومت کی بنیاد ''مذہب'' کے محافظ ہوں کیا اسی قوم کا سرمایہ ان مدارس پر صرف کرنا بے فائدہ اور ضائع کرنا ہے؟

یاد رکھیئے جس طرح دینی مدارس سے مذہب اور اسلامی قومیت کی حفاظت ہوتی ہے اسی طرح ملک کی حفاظت اور اس کے استحکام کا دارومدار بھی ان ہی مدارس پر ہے اور جس طرح مطالبہ پاکستان کے لیے مسلم قومیت اور مذہب اسلام مستحکم اور مضبوط چٹان کی طرح ثابت ہوئے جو ان سے ٹکرایا پاش پاش ہوگیا اسی طرح آج بھی پاکستان کے بقاء اور استحکام کے لیے ان کو وہی حیثیت اور مقام حاصل ہے جس کا ستمبر ۶۵ء کی جنگ میں مشاہدہ بھی ہو چکا ہے اور اسلام اور مسلم قومیت کے بقاء اور حفاظت کی ضامن چونکہ صرف یہی دینی تعلیم ہے جو مدارس دینیہ میں حاصل ہوتی ہے اس لیے جتنی اہمیت اور ضرورت انگریزی دور میں دینی مدارس کے بقاء اور قیام کی تھی اس سے بڑھ کر ان مدارس کی آج پاکستان میں ضرورت ہے اس لیے کہ یہ مدارس جس طرح ملت اسلام اور دینی تعلیم کی حفاظت کے واسطے مضبوط قلعے ہیں اسی طرح ملک پاکستان کو بھی اغیار کے حملوں سے بچانے کے مضبوط و مستحکم اڈے ہیں۔ ان مدارس سے غفلت برتنا اور ان کے وجود کو ہی بے کار سمجھنا اور حسب استطاعت ان کی ترقی میں حصہ نہ لینا ملت اسلام اور ملک پاکستان دونوں کی بنیاد سے بے پرواہی برتنے اور چشم پوشی کرنے کے مترادف ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ملت اسلام اور ملک پاکستان کے پاسبان ومحافظ، ان مدارس دینیہ کی امداد وحفاظت اوران کے ساتھ تعاون کرنے کی توفیق عنایت فرمائیں، آمین۔وما علینا الا البلاغ المبین وآخردعونا ان الحمد للہ رب العلمین۔

۱۴رمضان المبارک۸۶ھ